عزیز احمد کے ناول ''ایسی بلندی ایسی پستی'' کا پسِ نو آبادیاتی مطالعہ

A Post Colonial Study of Aziz Ahmed's Novel "Aisi Bulandi Aisi Pisti"

[i] طاہرہ بی بی [ii] ڈاکٹر فرزانہ کوکب

Abstract:

Postcolonial study examines the cultural, social, and psychological effects imposed by colonial systems on subjugated nations. In this context, Aziz Ahmad's novel "Asi Bulandi Asi Pasti" highlights the moral, social, and cultural decline of the elite and middle classes influenced by colonial civilization. The title of the novel symbolizes the contradiction between outward grandeur and inner degradation. Through blind imitation of Western culture, luxury, marital hypocrisy, sexual promiscuity, and class arrogance, the novelist demonstrates that the colonial system produced a class that appeared refined and civilized outwardly but was inwardly hollow, insensitive, and alienated from its own culture.

Keywords: *Postcolonialism, Urdu novel, cultural imitation, elite class, moral decline, cultural alienation.*

پس نوآبادیاتی مطالعہ اُن تہذیبی، سماجی اور نفسیاتی اثرات کا جائزہ لیتا ہے جو سامراجی نظام محکوم اقوام پر مرتب کرتا ہے۔ اس تناظر میں عزیز احمد کا ناول ''ایسی بلندی ایسی پستی'' نوآبادیاتی تمدن سے متاثر اشرافیہ اور متوسط طبقے کی اخلاقی، سماجی اور تہذیبی گراوٹ کو نمایاں کرتا ہے۔ ناول کا عنوان ظاہری شان و شوکت اور باطنی پستی کے تضاد کی علامت ہے۔ مغربی تہذیب کی اندھی تقلید، عیش پرستی، ازدواجی منافقت، جنسی بے راہ روی اور طبقاتی غرور کے ذریعے مصنف نے واضح کیا ہے کہ سامراجی نظام نے ایسے طبقے کو جنم دیا جو بظاہر مہذب مگر اندر سے کھوکھلا، بے حس اور تہذیبی بیگانگی کا شکار ہے۔

کلیدی الفاظ: پس نوآبادیات، اُردو ناول، تہذیبی نقالی، طبقۂ اشرافیہ، اخلاقی زوال، تہذیبی بیگانگی۔

پس نوآبادیاتی مطالعہ جدید ادبی اور فکری نظریات میں ایک اہم نظریہ ہے جس کا تعلق اُن سیاسی، سماجی، تہذیبی اور نفسیاتی اثرات کے مطالعے سے ہے جو نوآبادیاتی طاقتوں نے محکوم اقوام پر مرتب کیے۔ ''نوآبادیات'' سے مراد وہ نظام ہے جس کے تحت یورپی طاقتوں خصوصاً برطانیہ نے ایشیا، افریقہ اور دیگر خطوں پر سیاسی و معاشی تسلط قائم کیا، جب کہ ''پس نوآبادیات'' اُس عہد اور فکر کو ظاہر کرتا ہے جو استعمار کے خاتمے کے بعد پیدا ہوئی۔ اس نظریے کے تحت یہ دیکھا جاتا ہے کہ استعمار نے مقامی زبان، ثقافت، تاریخ، شناخت اور طرزِ فکر کو کس طرح متاثر کیا اور محکوم اقوام نے اس تسلط کے خلاف کس نوعیت کی مزاحمت کی۔ ایڈورڈ سعید، ہومی کے بھابھا، گائتری چکروتی جیسے مفکرین نے اس نظریے کو علمی بنیاد فراہم کی اور استعمار، طاقت، غیریت، شناخت اور مزاحمت جیسے مباحث کو واضح کیا:

[i] اسکالر پی ایچ ڈی، شعبہ اردو، بہاؤ الدین یونی ورسٹی ملتان۔
[ii] صدر نشین، شعبہ اردو، بہاؤ الدین یونی ورسٹی ملتان (Corresponding Author)

اُردو ادب میں پس نوآبادیاتی شعور برطانوی استعمار کے دور ہی سے پیدا ہونا شروع ہو گیا تھا۔ برصغیر میں انگریزوں کی آمد کے بعد نہ صرف سیاسی اور معاشی نظام تبدیل ہوا بلکہ تہذیبی، تعلیمی اور فکری سطح پر بھی گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ اُردو ادب خصوصاً ناول نے اس صورتِ حال کو شدت سے محسوس کیا۔ ابتدائی اُردو ناولوں میں اصلاحِ معاشرہ، تہذیبی بقا اور مغربی اثرات کے مقابل مقامی اقدار کے تحفظ کا رجحان نمایاں نظر آتا ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں میں مسلم معاشرے کی اصلاح اور تہذیبی تحفظ کا شعور موجود ہے، جب رتن ناتھ سرشار نے تہذیبی زندگی اور سماجی تبدیلیوں کو اپنے بیانیے کا حصہ بنایا۔ یہ وہ ابتدائی صورتیں تھیں جنھوں نے بعد میں اُردو ناول میں پس نوآبادیاتی شعور کی بنیاد فراہم کی۔[1]

اُردو ناول کی روایت میں پس نوآبادیاتی فکر تقسیمِ ہند کے بعد زیادہ شدت کے ساتھ سامنے آئی۔ تقسیم نے برصغیر کے انسان کو شناخت، تہذیب، وطن اور وجود کے بحران سے دوچار کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو ناول نگاروں نے ہجرت، بیگانگی، تہذیبی شکست اور تاریخ کے انتشار کو اپنی تخلیقات کا موضوع بنایا۔ آگ کا دریا میں برصغیر کی تہذیبی تاریخ اور شناخت کے بحران کو وسیع تناظر میں پیش کیا گیا ہے، جب کہ اداس نسلیں نوآبادیاتی عہد، جنگِ عظیم اور تقسیم کے اثرات کو انسانی زندگی کے تناظر میں بیان کرتا ہے۔ اسی طرح بستی تہذیبی زوال، ہجرت اور ماضی کی بازیافت کا ایک اہم استعارہ بن جاتا ہے۔

پس نوآبادیاتی مطالعے میں تہذیبی تصادم اور شناخت کا بحران بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ اُردو ناول میں مغربی تہذیب اور مشرقی اقدار کے درمیان کشمکش کو بار بار موضوع بنایا گیا ہے۔ نوآبادیاتی نظام نے ایک ایسی ذہنیت پیدا کی جس میں مقامی فرد اپنی تہذیب سے دور اور مغربی فکر سے مرعوب دکھائی دیتا ہے۔ اس کے نتیجے میں احساسِ کمتری، تقلیدی رویے اور تہذیبی انتشار جنم لیتے ہیں۔ اُردو ناول نگاروں نے اس صورتِ حال کو نہ صرف بیان کیا بلکہ اس کے خلاف تہذیبی مزاحمت بھی پیش کی۔

پس نوآبادیاتی مطالعہ جدید ادبی نظریات میں ایک اہم فکری دبستان ہے جو استعمار کے سیاسی، تہذیبی، معاشی اور نفسیاتی اثرات کا مطالعہ کرتا ہے۔ برصغیر میں برطانوی استعمار نے صرف اقتدار پر قبضہ نہیں کیا بلکہ مقامی تہذیب، زبان، معاشرت اور انسانی ذہن کو بھی گہرے طور پر متاثر کیا۔ اُردو ناول نے اس

نوآبادیاتی تجربے کو نہایت حساس انداز میں اپنے بیانیے کا حصہ بنایا۔ عزیز احمد کا ناول ایسی بلندی ایسی پستی اسی پس منظر میں ایک اہم تخلیق ہے جس میں نوآبادیاتی تمدن کے زیرِ اثر پروان چڑھنے والے اشرافیہ طبقے کی تہذیبی نقالی، اخلاقی زوال، سماجی منافقت اور ذہنی غلامی کو گہرے طنزیہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ناول نگار نے ان کرداروں کی ظاہری شان و شوکت، مغربی طرزِ زندگی اور مصنوعی تہذیب کو "بلندی" کے بجائے دراصل "پستی" قرار دیا ہے۔ اس ناول میں نوآبادیاتی معاشرے کے ان داخلی تضادات کو آشکار کیا گیا ہے جہاں اقتدار، دولت، جنس، نمود و نمائش اور مغربی تقلید انسانی اقدار، خاندانی رشتوں اور اخلاقی شعور پر غالب آ جاتے ہیں۔ عزیز احمد نے اس ناول کے ذریعے واضح کیا کہ سامراجی نظام نے ایک ایسے اشرافیہ طبقے کو جنم دیا جو بظاہر مہذب اور ترقی یافتہ دکھائی دیتا ہے مگر باطن میں اخلاقی انتشار، روحانی کھوکھلے پن اور تہذیبی بیگانگی کا شکار ہے۔

ناول کے عنوان کے مطابق لفظ "بلندی" کو اشرافیہ طبقے کی مال و دولت کو ذہن میں رکھ کر بیان کیا گیا ہے جب کہ مجموعی طور پر اشرافیہ کی پستی ہی پستی کو ظاہر کی گئی۔ سماجی اور ازدواجی طور پر یہ لوگ کس حد تک پست ہیں؟ اس بات کو مصنف نے زیادہ عیاں کیا اور ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اخلاقی اور سماجی حوالے سے یہ لوگ عام آدمی سے ہزار درجے پست ہیں۔ نوآبادیاتی تمدن میں گھرے یہ لوگ جس آرام و آسائش اور سامراجی تہذیب کو بلندی سمجھتے ہیں۔ ناول نگار اسے "پستی" تصور کرتا ہے۔ یہ بلندی پستی ہی کی ایک شکل ہے۔ لفظ "بلندی" کو مصنف نے طنزاً استعمال کیا ہے یعنی بلندی انھیں ایسی پستی میں لے جاتی ہے جو بہت بدبودار ہے۔

جس طرح اودھ کے حکمرانوں نے اپنے سارے ریاستی امور انگریزوں کو سونپ دیے تھے اور امراء صرف عیش پرستی میں مگن ہو کر سیاسی معاملات سے دور ہو گئے تھے، اسی طرح حیدرآباد دکن کے حکمرانوں نے نوآبادیاتی اسٹرکچر کو پوری طرح قبول کر لیا تھا، کیوں کہ ان کی زندگی کا ایک ہی مقصد رہ گیا تھا کہ ان کی عیش و عشرت اور عظمت و اقتدار کو کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ اس کے علاوہ انھیں کسی اور بات سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ ناول نگار نے ایسی بلندی ایسی پستی کے عنوان کو طنزاً ایسے امراء کے لیے تجویز کیا جو انگریز سامراج کے ساتھ جڑ گئے تھے اور جنھوں نے مغربی کلچر کو پوری طرح اپنی زندگیوں کا حصہ بنا لیا تھا۔ کشن پلی کی پہاڑیوں میں فرخندہ نگر کی نوآبادی میں بسنے والے ان امراء کی زندگی پر لکھتے ہیں کہ عجب کارخانہ طلسمات

تھا کہ نہ کوئی محنت کرتا تھا نہ مزدوری، لیکن ہر شخص صاحبِ مال و اختیار تھا۔ ناول کے آغاز میں سطح مرفع پر جرمن طرزِ تعمیر کے مطابق بننے والے مکانوں کی بلندی اور پستی کو مختلف نام دے کر ان کا مذاق اڑایا گیا ہے کیوں کہ ان گھروں کے عجیب عجیب نام رکھے گئے تھے۔ مثلاً ایک منزل کا نام 'گلگدہ' کی جگہ The Rock رکھ دیا گیا۔ مصنف کے بقول اگر اُردو ترجمہ کرکے اس کا نام 'چٹان' رکھا جاتا تو یہ انسانی حسِ مزاح کے لیے مفید ہوتا۔ایسی بلندی ایسی پستی نوآبادیاتی تمدن کی وجہ سے اخلاقی طور پر دیوالیہ ہو جانے والے اشرافیہ طبقے پر لکھا گیا ناول ہے۔ ناول نگار اس طبقے پر گہرا طنز کرتا ہے۔ انگریزی عہد میں تقسیمِ ہند تک ہونے والے نوآبادیاتی تمدن کے اثرات کو مصنف ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

> تین مرتبہ امیر گھرانوں پر مغربی تمدن کی لہریں اُمڈ چکی ہیں۔ پہلے تو غدر کے بعد سرسید کے زمانے میں قابل جنگ اور مشہور الملک نے اسی زمانے میں اپنی معاشرت بدلی۔ یہ اُس قسم کی مغربیت تھی جیسے ترکی اور مصر کی مغربیت۔آج یعنی انگریزی رہائش، انگریزی کپڑے، رائڈنگ، لڑکیوں کے لیے فراکیں، گھر میں ہر ایک ڈارلنگ، کتے، انگریزی کھانا، شراب، بٹلر، کرسچین آیائیں۔ غرض صاحب لوگ بننے کی تحریک۔ دوسری مرتبہ مغربیت کی یورش ہوئی اس نے اندر سے بدلنا چاہا۔ اس کے ساتھ قوم پرستی، خود داری، وفا اور مغرب کے ادب، علوم و فنون، سائنس وغیرہ کی رغبت۔ اس دوسری طرح کی مغربیت کا ہمارے ناول کے کرداروں پر کم اثر پڑا۔ کیوں کہ اس دوسرے دور کی داخلی مغربیت کے ساتھ ہی ساتھ وہی انگریزی کپڑوں، بول چال، کلب، ناچ، وہسکی اور سوڈے کا ریلا بھی آیا جو ہمارے کرداروں کو بہالے گیا اور تیسری اور آخری مغربیت، اسے مغربیت کہہ لیجئے یا مزدکیت یعنی اشتراکی آزاد خیالی، یہ تحریک پھیلی تو سہی مگر محض ایک ذہنی فیشن بن کر آئی۔ اس سے ہندوستان کے عوام میں انقلاب کی صلاحیت کی قصے سے افراد کو اس سے سروکار نہ تھا اور نہ اب ہے۔ مالا بار ہل پر تو کسی کسی آرام کرسی کو اس نے فتح کر بھی لیا ہو، کشن پلی کی بلندیوں پر یہ چڑھ نہ سکی۔[۲]

ناول نگار کے خیال میں نوآبادیاتی تمدن نے مقامی معاشرت اور خصوصاً انگریزی عہد میں جنم

لینے والے نئے طبقات پر گہرے اثرات ڈالے ہیں۔ سیاسی، سماجی اور علمی طور پر بظاہر چمک دمک رکھنے والے یہ لوگ اندر سے بالکل خالی اور کھوکھلے ہوتے ہیں۔ معاشی طور پر مضبوط طبقہ اپنی سماجی اقدار اور اخلاقی حوالے سے انتہائی گراوٹ کا شکار ہے۔ انھی نظریات کے سبب عزیز احمد نے اس ناول میں نواب قابل جنگ کی بیٹی خورشید زمانی بیگم کے اینگلو انڈین مزاج اور وکٹوریائی نمونوں کو کڑی تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ خورشید زمانی کی شادی کرنل سنجر بیگ سے طے ہوئی جن کے خاندان کو جلد انگریزوں کی طرف سے خطاب ملنے کی توقع ہے اور اس ہندوستانی میم نے فرخندہ نگر کی معاشرت میں اپنی شادی میں خود مہمانوں کی خاطر داری کر کے ایک نئی تاریخ رقم کی۔ پانچ بچوں کی ماں بننے کے بعد بھی وہ اپنے بڑھاپے کو قبول کرنے سے منکر تھیں اور اس نے چست سے چست بلاؤز پہننے شروع کر دیے۔ بالکل اٹھارہ برس کی لڑکیوں کا سا فیشن شروع کیا۔ قصہ مختصر دشمن سے مقابلہ کرنے کے لیے ہر حربہ انھوں نے استعمال کیا مگر دشمن تھا کہ بڑھتا ہی چلا آیا۔ اپنی تین بہنوں نازلی، ناظمہ اور کہکشاں کے علاوہ دو بھائیوں نیازی اور محمود حسین سے حسد اور رشک کرنا بھی اس کردار کی زندگی کا خاصہ ہے۔ اپنی امارت کی خوبو دکھانا اور ہم چشموں میں سب سے اونچا مقام حاصل کرنا ہی اس عورت کی شدید خواہش ہے۔ خورشید زمانی بیگم اپنی بچیوں کا اچھی جگہ رشتہ کرانے کی ماہر خاتون ہے اور ان کی شادی امیر ترین لوگوں میں کرنے کی بڑی وجہ اپنے بہن بھائیوں کو نیچا دکھانا بھی ہے۔

خورشید زمانی بیگم کی ایک بیٹی سرتاج کو دولت، گلیمر اور انگریزی تمدن کی آرائشوں کے علاوہ خوب صورت اور مہنگی ساڑھیوں کا بہت شوق ہے۔ اس کی ماں نے اپنی حیات میں اس کی ذات کی تجدید کی تھی اسی لیے وہ ایک جاگیر دار محی الدین سے شادی کرنے کے لیے رضامند ہو جاتی ہے۔ سرتاج کو زیادہ تر جاگیر کے روپے، بھڑک دار چوڑے بارڈر کی ساڑھیوں، زیور، رولس رائس، آرام، شان و شوکت اور ٹیپ ٹاپ سے دل چسپی تھی۔ اسے اپنے بدصورت شوہر کی حسن و سیرت سے زیادہ اس کی دولت سے پیار ہے کیوں کہ سرتاج کے نزدیک بہترین کمپنی کی کار ہونا ضروری ہے، چاہے وہ کتنی پرانی ہی کیوں نہ ہو۔ وہ سمجھتی ہے کہ رولس رائس اس کے اقتدار اور رتبے کو قائم رکھنے کا سبب ہے۔ پھر کمیشن ملنے کے بعد اپنے بیٹے خاقان کی ذی جاہ جنگ کی بیٹی سروری سے شادی خورشید زمانی بیگم کے لیے درد سر بن جاتی ہے۔ سروری اس حد تک آزاد خیال اور آوارہ صفت ہے کہ خاقان کے سبھی دوستوں کے علاوہ آرڈرلیوں تک سے پھنسی ہوئی ہے۔ ایک عظیم الشان لڑائی کے بعد سروری اپنی ساس کو تھپڑ مار کر اپنے شوہر کو نئے گھر لے جاتی ہے۔ خورشید زمانی

بیگم کی دوسری بیٹی مشہور النساء اپنے باپ سنجر بیگ کی مرضی کے خلاف اور ماں کی رضا مندی سے ایک مال دار شخص ابو شم انجینئر سے شادی کرنے کے لیے تیار ہو جاتی ہے۔ ناول نگار نے قابل جنگ کی پوری نسل اور فرخندہ نگر کی عورتوں کے کردار اور عشق کو آڑھے ہاتھوں لیا۔ اینگلو انڈین لڑکیوں کے خیالات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> عشق عشق ہی نہیں تھا جب تک اس میں بدمعاشی کی شان نہ ہو۔ وہ عشق عشق نہیں تھا جس میں ڈینگیں نہ ماری جائیں اور خواہ انجام شادی ہی کیوں نہ ہو پینگیں بڑھا کے لڑکی کو خراب کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔ یہ وہ عشق تھا جس کی وہسکی کے گلاسوں سے بڑا گہرا تعلق تھا۔[۳]

اسی رنگین ماحول میں ایک تعلیم یافتہ، باہنر شخص اور ناول کے ہیرو سلطان حسین انجینئر کا کردار منظر عام پر آتا ہے، جو بارو زگار اور مال دار ہونے کے سبب اشرافیہ میں خاص مقام رکھتا ہے لیکن شادی کو جبر سمجھتا ہے۔ اس کے چاہنے والوں کا حلقہ بہت وسیع ہے لیکن جن لڑکیوں سے وہ عشق کرتا ہے ان میں سے کسی کو اپنی بیوی بنانے کو تیار نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے زیادہ عمر ہونے کے باوجود ابھی تک شادی نہیں کی ہے، کیوں کہ شادی اسے اپنی آزادی کے لیے خطرہ محسوس ہوتی ہے۔ عمر رسیدگی اور تنہائی کا یہ عالم ہے کہ اب تو مسوری میں شکار کے دنوں میں نئی چڑیا اس محبت کے شکاری کی جال میں آنے سے بچتی ہے۔ لہٰذا سلطان حسین شادی کے لیے خورشید زمانی بیگم کی بیٹی نور جہاں کا رشتہ لینے اپنی بہن زبیدہ اور ماں کو بھیجتا ہے۔ سلطان حسین کی دولت اور وجاہت نے خورشید زمانی بیگم کو اپنی بیٹی نور جہاں کی شادی کے لیے پُر کشش اور پردیش نامی خاتون ملتی ہے جن کے آپس میں پرانے تعلقات ہیں۔ سلطان اپنی بیوی کو کمرے میں چھوڑ کر کملہ پردیش کے ساتھ شراب پی کر رنگ رلیاں مناتا ہے۔ جب دونوں ایک دوسرے سے جدا ہو رہے ہوتے ہیں تو نور جہاں انھیں دیکھ لیتی ہے۔ وہ سوچتی ہے کہ سلطان حسین کتنا کم ظرف اور گھٹیا ہے کہ ہنی مون کے موقع پر نئی نویلی دلھن کو چھوڑ کر غیر عورت کے ساتھ مستیوں میں محو ہے۔ میاں بیوی کے درمیان شادی کے آغاز میں ہی اعتماد کا فقدان پیدا ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے وہ اپنے خاوند کے ہر عمل کو شک کی نظر سے دیکھتی ہے۔ سلطان حسین کی آزاد پسندی اور رنگین مزاجی کے رد عمل میں نور جہاں نے اپنے خاوند کی ناپسندیدگی کے باوجود مختلف محفلوں میں جانا شروع کر دیا۔ نور جہاں ایک محفل میں اپنے بچپن کے

دوست اطہر سے ملتی ہے تو سلطان اپنی بیوی کو غلیظ گالیاں دیتے ہوئے حرافہ اور رنڈی کہتا ہے تو میاں بیوی میں فساد شروع ہو جاتا ہے۔ نور جہاں کی مشرقیت آپے سے باہر ہوئی تو سلطان نے اپنی بیوی پر ہاتھ اُٹھایا:

> ہندوستان میں عورت کے جسم پر مرد کی جو حکومت تھی اب وہ مٹ رہی تھی۔ یہ تھپڑ اس مٹتی ہوئی حکومت کو پھر سے قائم کرنے کی کوشش تھی۔ اورنگزیب اگر کسی پیش امام کے گھرانے میں پیدا ہوتا تو عمر بھر پابندی سے مسجد کی امامت کرتا یا بڑا اچھا واعظ بن جاتا مگر نہ اپنے والد کو قید کرتا نہ اپنے بھائیوں کو قتل کراتا۔۔۔ انسان پر انسان کی حکومت اور اس حکومت کی خواہش سے زیادہ مہلک کوئی اور نشہ نہیں۔ نور جہاں میں سلطان حسین نے عورت کو معمولی سامانِ خریداری کے برابر سمجھا تھا۔ اس میں نہ صرف نسوانیت بلکہ انسانیت کے وقار کو صدمہ پہنچایا تھا۔ یہ سلطان حسین کی زندگی کی ٹریجڈی تھی۔ یہ اس کی خطا تھی۔[۴]

اس واقعہ کے بعد خورشید زمانی بیگم اپنے اہل و عیال کے ساتھ سلطان کے گھر جا کر ہنگامہ برپا کرتی ہے۔ اس کے سبھی گھر والوں کی بے عزتی کرتی ہے۔ سلطان بیوی سے صلح کر کے اس سے معافی مانگتا ہے لیکن جب اسے اطہر اور نور جہاں کے درمیان دوستی کا پتا چلتا ہے تو وہ پھر نور جہاں سے ناراض ہو جاتا ہے، نور جہاں نے فیصلہ کر لیا کہ سلطان سے خلع لے کر علاحدگی اختیار کر لی جائے۔ جب سلطان اسے طلاق دیتا ہے تو نور جہاں اپنے جہیز کا سارا سامان اٹھا لیتی ہے۔ نور جہاں کی ذہنی پستی اس وقت ظاہر ہوتی ہے جب وہ جہیز کا سامان اٹھاتے وقت چھوٹی سے چھوٹی چیز کے لیے بہت شور مچاتی ہے۔ انسانی زندگی کے بجائے سامان کی قدر و قیمت اور لگژری اشیاء کی قیمت رشتوں سے زیادہ دکھائی گئی ہے حالاں کہ اس کی گود میں سلطان کی ایک بیٹی بھی تھی۔ نور جہاں اور سلطان حسین کی ازدواجی زندگی منافقانہ تھی۔ وہ شوہر کے رویے سے تنگ آ کر جارحانہ قدم اٹھاتے ہوئے سلطان حسین سے علاحدگی اختیار کر کے بچپن کے دوست اطہر کو اپنا جیون ساتھی بنا لیتی ہے۔ اطہر بھی عورتوں پر فریفتہ ہونے والا آدمی ہے جو حاملہ اور شادی شدہ عورتوں کی طرف نہیں دیکھتا لیکن نور جہاں کے ساتھ بچپن میں گذارے دن اس کی یادوں سے نہیں نکلتے ہیں۔ وہ نور جہاں پر فدا ہو جاتا ہے اور دونوں کی شادی ہو جاتی ہے۔ سلطان حسین بھی خدیجہ سے شادی کر لیتا ہے جو اس کا حقِ ملکیت پوری طرح تسلیم کر لیتی ہے۔

متوسط طبقے کے منفی کردار کو اجاگر کرنے کے لیے مصنف نے اس ناول میں سریندر کے کردار کو سلطان حسین کے دوست کے طور پر متعارف کرایا جو اپنی بدصورتی کی وجہ سے معشوق بننے کی بجائے ہمیشہ لڑکیوں کا عاشق ہی رہتا ہے۔ وہ آل انڈیا ریڈیو میں چھے سو روپے ماہ وار تن خواہ لیتا ہے لیکن سگریٹ، شراب، جوا اور کلب میں آنے والی ہر لڑکی کو اپنا سلام ضرور پیش کرتا ہے۔ چوں کہ سیاست کو وہ متوسط طبقے کا کھیل سمجھتا ہے، اس لیے پابندی سے کمیونسٹوں کی ہر تحریر کو پڑھتا ہے اور لاکھ جتن کرکے انٹرنیشنل پریس کارسپانڈنٹ بھی منگواتا ہے۔ سلطان اس بات کو تسلیم نہیں کرتا کہ سیاست متوسط طبقے کا کھیل ہے لہٰذا سریندر سے بحث کے دوران اسے اپنی رائے دینی پڑتی ہے:

> سیاست کی پیچھے بھی سرمایہ ہے۔ تم سمجھتے ہو کہ کانگریس کے برلا اور ڈالمیا کی طاقت نہیں۔ یا مسلمانوں کی یہ جماعت مسلم لیگ، جو دن بدن زور پکڑتی جارہی ہے، اس کے پیچھے یو پی اور پنجاب کے زمیندار نہیں۔ یار یہ کہو کہ طاقت ہے دراصل اعلیٰ طبقے کے ہاتھ میں۔ وہ متوسط طبقے سے دماغی مزدوری لیتے ہیں اور ادنی طبقے سے جسمانی مزدوری۔[۵]

ناول کے ماحول کے مطابق موقع ملتے ہی ناول نگار بڑے طبقے کے علاوہ متوسط طبقے کو بھی تنقید کا نشانہ بناتا ہے، کیوں کہ وہ سمجھتا ہے کہ یہ لوگ راجاؤں مہاراجاؤں کے خلاف کتابیں اور مضامین لکھنے کے علاوہ آپس میں باتیں بھی کرتے ہیں، لیکن اگر کسی مہاراج کمار کے پاس سے چائے کی دعوت آجائے تو سگے بھائی کو مرتا چھوڑ کر ضرور جائیں گے۔ ناول کے آخر میں ایک محفل میں دیوان بہادر اور آرائش جنگ جیسے جاگیردار اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی تعریف میں محو ہیں اور سریندر اپنے علاوہ نواب آرائش جنگ کے سر پر شرافت کا تاج رکھتا ہے۔ اسی دوران میں ریڈیو پر برصغیر پاک و ہند کی تقسیم کا اعلان ہوتا ہے۔ بنگال اور پنجاب کی تقسیم سن کر نوابوں نے سکون کا سانس لیا، کیوں کہ چاہے جتنی تقسیم در تقسیم ہو دیوان بہادر اور آرائش جنگ کو معلوم تھا کہ نظم و نسق انھی کے ہاتھ میں رہے گا۔ آخر کار وہی بلائے جائیں گے۔ تاش کے پتے پھینکے جارہے تھے اور ہندوستان کی تقسیم اور فسادات پر بحث بھی جاری تھی۔ سریندر کو جب پتا چلتا ہے کہ اس کا دوست سلطان حسین حرکتِ قلب بند ہونے کے باعث مر چکا ہے تو بہت زیادہ شراب پی کر غم زدہ ہونے کے بعد جوں ہی اسے تقسیمِ ہند کا خیال آتا ہے تو وہ خوش ہو کر کہتا ہے:

کیا مزہ آئے گا۔۔۔ آہاہا۔۔۔ ہندوستان میں رام راج اور پاکستان میں حکومت الٰہیہ۔ اور دونوں جگہ ہمارا متوسط طبقہ اعلیٰ طبقے اور مزدور طبقے کو پھر سے بے وقوف بنائے گا۔ اچھا ہوا سلطان حسین انجینئر تو بڑے موقعے سے اس دنیا سے چل دیا۔ اب عالم بالا میں خیالی محل بنایا کر۔ ہم بھی مرنے کے بعد تیرے بنائے ہوئے مکانوں کی سیر کریں گے۔[۶]

عزیز احمد اونچے اور متوسط طبقے کی سبھی حقیقتوں کو اپنے قاری کے لیے کھولتا ہے۔ زیادہ تر ناول کا ماحول بڑے طبقے کے لوگوں کی طرزِ زندگی ہے جس کو ناول نگار نے اپنے مشاہدے کی بنا پر بڑی باریک بینی سے بیان کیا ہے۔ عزیز احمد نے اس نام نہاد مہذب طبقے کے گھٹیا پن کو طنزاً بیان کیا ہے۔ ان لوگوں میں جو بظاہر بلندی دکھائی دیتی ہے، وہ اندر سے اخلاقی اور معاشرتی پستی ہے۔ سامراج کے زیرِ سایہ پروان چڑھنے والے یہ مغربی نقال ایسی سماجی اور اخلاقی گراوٹ کا شکار ہیں کہ وہ عام آدمی کی مشکلات کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ یہ سامراجی کٹھ پتلیاں مغرب کی دی ہوئی سماجی و معاشی آزادی کے علاوہ کچھ سوچنے کے قابل ہی نہیں۔ ناول نگار ان لوگوں کی تمدنی زندگی کو انگریز کی نقالی اور ان کی سیاسی بصیرت کو ان کا ذاتی مفاد سمجھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جگہ جگہ ان لوگوں پر طنز کرتا ہے کہ یہ ان کی اصلی زندگی نہیں بلکہ کسی اور کی دی ہوئی زندگی ہے جس میں انسانیت نام کی کوئی چیز ہی نہیں۔ سبھی کرداروں کی منفی ذہنیت اور سماجی حیثیت کو سامنے رکھ کر محمد اسلم فاروقی لکھتے ہیں:

درباری واقعات، امراء کی باہمی سازشیں، خاندانی رقابتیں، ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش اپنے تمول کا اظہار، دوسروں پر اپنی بڑائی جتانے کا رجحان، ان کے عشق، ان کی ہوس پرستیاں، ان کی عیاشیاں، مستورات کے آداب و انداز، گفتگو، زنانی محفلوں کی ہنگامہ آرائیاں، ظاہری خلوص، درپردہ حسد، مشرقی تہذیب کو اختیار کرتے ہوئے مشرقی تہذیب سے دور، مغربی تہذیب کو اپنانے کی کوشش، کعبہ اور کلیسا کی کشمکش۔ ایک طرف دولت و ثروت کا جاہ و جلال اور دوسری طرف اخلاقی بے مائیگی، ایسی بلندی ایسی پستی۔۔۔ ان سب کی تصویریں، تصویریں ہی نہیں ان پیچ و خم کے چلتے پھرتے مظاہرے پورے ناول میں جا بجا ملتے ہیں۔[۷]

سلطان حسین اور نور جہاں نے خود کو بدلنے کی کوشش نہیں کی بلکہ انھوں نے علاحدگی اختیار کرتے ہوئے اپنی مرضی کی زندگی گذارنے کو ترجیح دی، سو یہ لوگ اپنی ذات، جبلت اور خواہشات کے غلام ہیں۔ سلطان حسین سماجی اور ازدواجی حوالے سے منافق کردار ہے جو اخلاقی طور پر دیوالیہ ہے۔ وہ بیوی کی پروا کیے بغیر باہر کی عورتوں میں جنسی وجذباتی پناہ تلاش کرتا ہے۔ اس میں دوغلہ پن ہے۔ وہ اخلاقی اور معاشرتی طور پر کم ظرف ہے۔ اس کی ماں اور بہن اسے گالیاں اور طعنے دیتی ہیں کہ اس کی وجہ سے خورشید زمانی بیگم نے ان کی بے عزتی کی۔ ماں بیٹی نے اپنی ذلت کو محسوس کیا لیکن سلطان حسین کو اپنی ذات، خواہشات اور لذتوں کے علاوہ کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ دراصل ناول کا ہیرو جس سامراجی اور نوآبادیاتی تمدن میں گھر چکا ہے اس کا بڑا نقصان یہی ہے کہ انسانی سطح کے جو معیارات مقامی لوگ خود اپنے لیے بناتے ہیں، وہ سلطان حسین ایسے لوگوں کو بڑے کھوکھلے اور فضول لگتے ہیں، کیوں کہ نئی تہذیب کی چکاچوند انھیں پاگل کر دیتی ہے اور وہ اخلاقی اور سماجی سطح پر بے سمت ہو جاتے ہیں۔

ناول کے مردانہ کردار شراب اور شباب کے رسیا ہیں۔ انھیں عورتوں سے جنسی تعلق بڑھانے اور قائم رکھنے کے تمام طریقے خوب آتے ہیں۔ عورت اور مرد کا رشتہ عزت و تکریم اور انسانیت کے بجائے صرف جنس کے ارد گرد گھومتا ہے۔ مرد عورت کو اس طرح دیکھتا ہے جیسے اسے ہر صورت میں حاصل کرنا ہے۔ مردوں اور عورتوں نے جنسی اعضاء کی شکل اختیار کر لی ہے۔ ان کی جبلت نے ان کے شعور پر قابو پا لیا ہے اور جس طرح جنسی اعضاء جبلت پر چلتے ہیں، اسی طرح یہ کردار بھی اپنی جبلت کے غلام ہیں۔ انھوں نے خود کو جنسی اشیاء میں ڈھال لیا ہے۔ شعور جبلت کے اور جبلت لذتوں کے تابع ہو گیا ہے۔ یہ لوگ جھوٹے اقتدار اور منافقت کے تابع ہو چکے ہیں اور ظاہری بود و باش ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔ ان کی فہم اپنی جبلت کی غلامی سے آگے نہیں جا سکتی کیوں کہ ان کے لیے یہی حقیقت اور یہی سچ ہے:

> خارجی دنیا میں یہ سب لوگ باعزت ہیں، لوگوں کے سامنے یہ سب مہذبانہ اطوار کا مظاہرہ کرتے ہیں مگر داخلی محاذ پر یہ غلیظ جذبات کو غلیظ لفظیات کے سہارے ادا کرتے ہیں۔[۸]

نوآبادیاتی تمدن پر مبنی اس ناول کے نسوانی کردار اپنے معاشرے میں جنس کا موضوع بن چکے ہیں۔ یہ مغرب سے متاثر عورتیں خود کو سجاتی اور سنوارتی ہیں تاکہ زیادہ سے زیادہ پُرکشش دکھائی دیں، جو

اپنی کم عمری ظاہر کر کے خوش ہوتی ہیں۔ ان پر نوجوان اور امیر لڑکے فدا ہوں تو ان کے لیے یہ بات باعثِ فخر ہو گی۔ سبھی عورتوں نے اپنی ڈور نوآبادیاتی تمدن کے ہاتھوں میں تھما دی ہے اور اس اخلاقی گراوٹ کے بعد طوائفانہ مزاج کی حامل ہو گئی ہیں۔ یہ عورتیں خود کو انسانی مخلوق نہیں سمجھتی بلکہ خود کو جنسی جبلت کی غلام سمجھتی ہیں جو زیادہ سے زیادہ مردوں کے لیے پُر کشش بن سکیں:

> ''ایسی بلندی ایسی پستی'' میں عزیز احمد نے نوآبادیاتی اشرافیہ کو طنزیہ پیرائے میں پیش کیا ہے۔ یہ طبقہ بظاہر تعلیم یافتہ، مہذب اور جدید دکھائی دیتا ہے مگر حقیقت میں اخلاقی انحطاط، جنسی بے راہ روی، احساسِ برتری اور روحانی کھوکھلے پن کا شکار ہے۔ ناول کے کردار مغربی لباس، انگریزی زبان، شراب نوشی، کلب کلچر اور مصنوعی تہذیب کو ترقی کی علامت سمجھتے ہیں، حالاں کہ مصنف کے نزدیک یہی ''بلندی'' دراصل ''پستی'' کی بدترین شکل ہے۔ اس تناظر میں ناول پس نوآبادیاتی فکر کے اُس تصور کی نمائندگی کرتا ہے جس میں محکوم اقوام کا اشرافیہ طبقہ سامراجی تہذیب کی نقالی کرتے ہوئے اپنی تہذیبی شناخت کھو دیتا ہے۔[۹]

ناول کا مرکزی کردار سلطان حسین ایک ایسے نوآبادیاتی ذہن کی علامت ہے جو آزادی، جنس اور ذاتی خواہشات کو زندگی کا مقصد سمجھتا ہے۔ اس کی ازدواجی زندگی اعتماد، احترام اور محبت سے خالی ہے۔ وہ عورت کو ایک انسان کے بجائے ملکیت اور جنسی شے کے طور پر دیکھتا ہے۔ یہی رویہ نوآبادیاتی معاشرے کے اُس مردانہ ذہن کی نمائندگی کرتا ہے جو بظاہر جدید اور روشن خیال ہے مگر داخلی سطح پر جاگیردارانہ اور استحصالی سوچ رکھتا ہے۔ اسی طرح نور جہاں، خورشید زمانی بیگم اور دیگر نسوانی کردار بھی مغربی تہذیب کی اندھی تقلید میں اپنی اصل شناخت کھو چکے ہیں۔ ان کی زندگی کا محور دولت، نمود و نمائش، جسمانی کشش اور سماجی برتری ہے۔ اس طرح ناول میں عورت بھی نوآبادیاتی تمدن کی ایک متاثرہ اور استحصالی علامت بن کر سامنے آتی ہے:

> عزیز احمد کے ہاں طنز ایک اہم فنی ہتھیار ہے۔ وہ اشرافیہ کی مصنوعی تہذیب، اخلاقی گراوٹ اور مغربی نقالی کو براہِ راست تنقید کے بجائے طنزیہ انداز میں بے نقاب کرتے ہیں۔ ''ایسی بلندی ایسی پستی'' کا عنوان ہی اس طنزیہ شعور کی بہترین مثال

ہے۔ ناول نگار نے واضح کیا ہے کہ نوآبادیاتی اشرافیہ کی بلندی دراصل انسانیت، اخلاقیات اور تہذیبی شعور کی پستی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ناول کے کردار بظاہر شاندار زندگی گزارتے ہیں مگر ان کی داخلی دنیا خوف، حسد، جنسی بے چینی، احساسِ عدم تحفظ اور روحانی و فکری خلا سے بھری ہوئی ہے۔[۱۰]

پس نوآبادیاتی نقطۂ نظر سے عزیز احمد کی ناول نگاری کا ایک اہم پہلو طبقاتی شعور بھی ہے۔ وہ صرف اشرافیہ ہی نہیں بلکہ متوسط طبقے کی منافقت کو بھی نمایاں کرتے ہیں۔ سریندر جیسے کردار بظاہر انقلابی اور ترقی پسند ہیں مگر عملی طور پر وہ بھی طاقت اور مراعات کے سامنے جھک جاتے ہیں۔ اس طرح ناول نگار واضح کرتا ہے کہ نوآبادیاتی نظام نے پورے سماج کو ایک ایسی ذہنی غلامی میں مبتلا کر دیا ہے جہاں طبقاتی مفادات، سیاسی منافقت اور ذاتی خواہشات انسانی اقدار پر حاوی ہو چکی ہیں۔

تاہم تنقیدی سطح پر یہ اعتراض بھی سامنے آتا ہے کہ عزیز احمد بعض اوقات اپنے کرداروں کے منفی پہلوؤں کو اس قدر شدت سے پیش کرتے ہیں کہ ان کی شخصیت کا متوازن اور انسانی رُخ پس منظر میں چلا جاتا ہے۔ سلطان حسین سمیت کئی کردار مکمل انسانی پیچیدگیوں کے بجائے ایک مخصوص نفسیاتی اور اخلاقی علامت محسوس ہوتے ہیں۔ اسی لیے بعض ناقدین کے نزدیک ان کے کردار کبھی کبھی 'ٹائپ کردار' بن جاتے ہیں۔ اس کے باوجود عزیز احمد کی اہمیت اس بات میں ہے کہ انھوں نے اُردو ناول میں نوآبادیاتی تہذیب کے اثرات، جنسی نفسیات، طبقاتی تضادات اور تہذیبی شکست کو جس جرات اور فکری گہرائی سے پیش کیا، وہ اُردو فکشن میں ایک منفرد مقام رکھتا ہے۔

مجموعی طور پر عزیز احمد کی ناول نگاری پس نوآبادیاتی مطالعے کے لیے نہایت اہم ہے کیوں کہ ان کے ہاں سامراجی نظام کے زیرِ اثر پیدا ہونے والے سماجی، تہذیبی اور نفسیاتی بحران پوری شدت کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔ ان کے ناول اس حقیقت کو واضح کرتے ہیں کہ نوآبادیاتی تمدن نے برصغیر کے اشرافیہ اور متوسط طبقے کو ظاہری چمک دمک تو عطا کی، مگر داخلی سطح پر انھیں اخلاقی، روحانی اور انسانی قدروں سے محروم کر دیا۔

نوآبادیاتی تمدن کی وجہ سے ہندوستان میں ایک اشرافیہ طبقہ پیدا ہوا، جس نے سامراجی کلچر کو اپنی زندگیوں کا حصہ بنالیا تھا۔ عزیز احمد نے اس ناول کے زیادہ تر کردار اسی طبقے سے لیے ہیں اور ان کرداروں

کو سامراج کی کٹھ پتلیاں اور نقال ظاہر کیا گیا ہے۔ سامراج کو اس طبقے پر اتنا اعتماد تھا کہ انھوں نے تقسیمِ ہند کے موقع پر ہندوستان کے سبھی معاملات انھی کے حوالے کر دیے تھے۔ انھیں یقین تھا کہ مستقبل میں بھی یہ لوگ ان کے آلہِ کار بنے رہیں گے۔ موروثی جاگیری نظام سے انگریزوں نے اپنے مفادات کا ٹھیکا روایتی حکمران طبقے کو عطا کر دیا۔ بہر حال، صاحبانِ عالی شان، فرنگستان اور ہندوستان کے جدید تعلیم یافتہ روشن خیال طبقے کی برابری کرنے کے لیے مغربی تہذیب کا ظاہری لیبل دیسی حکمرانوں نے اپنے اوپر چسپاں کر لیا تھا۔ یہ طبقہ نوآبادیاتی تمدن کے دائرے سے باہر نہیں نکلا۔ انھوں نے دنیا میں بڑی سیاسی تبدیلی یعنی نیو کلونیل ازم میں بھی سامراج کا ساتھ دیا اور تاحال برصغیر کا خطہ اُس کے شکنجے سے نہیں نکل سکا۔

حوالہ جات

۱۔ شافع قدوائی، فکشن مطالعات (ملتان: بیکن بکس، ۲۰۱۵ء)، ۱۸۔

۲۔ عزیز احمد، ایسی بلندی ایسی پستی (نئی دہلی: ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۸۶ء)، ۳۴۔

۳۔ ایضاً، ۶۷۔

۴۔ ایضاً، ۷۶۔

۵۔ ایضاً، ۸۳۔

۶۔ ایضاً، ۱۰۶۔

۷۔ محمد اسلم فاروقی، عزیز احمد کی ناول نگاری کا تنقیدی مطالعہ (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۱۵ء)، ۱۴۵۔

۸۔ عزیز احمد، ایسی بلندی ایسی پستی، ۱۱۶۔

۹۔ نزہت سمیع الزماں، عزیز احمد کی ناول نگاری (دہلی: عرشیہ پبلی کیشنز، ۲۰۱۸ء)، ۷۱۔

۱۰۔ اعظم راہی، عزیز احمد فکر و فن اور شخصیت (حیدر آباد: ادارہ ادبیاتِ اُردو، ۲۰۱۵ء)، ۳۰۸۔